بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے؟

یوں تو ہماری زندگی کا کونسا گوشہ ایسا ہے جس میں تضاد نہیں۔۔۔ تضاد قول اور عمل میں۔۔۔ تضاد قرآن کریم اور مروجہ قوانین میں، خواہ وہ قوانین کسی سابقہ دور میں وضع ہوئے ہوں اور انہیں فقہ یا احکامِ شریعت کا نام دے دیا گیا ہو اور خواہ وہ دور حاضر میں مغربی نظام جمہوریت کے تحت مسلمان مملکتوں میں وضع اور نافذ ہوئے ہوں۔۔۔ لیکن ان تمام گوشوں میں، سب سے زیادہ اہم گوشہ وہ ہے جس کا تعلق عورتوں کی پوزیشن سے ہے۔ ہمارے قول کی یہ کیفیت ہے کہ ہم ساری دنیا کو مخاطب کر کے، نہایت فخر سے، بانگ دہل، اعلان کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو بلند ترین مقام عطا کیا ہے۔ لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عورت سے زیادہ مظلوم، مجبور و مقہور طبقہ کوئی نہیں۔ طلوع اسلام، مظلوم انسانیت کے ہر طبقہ کی حمایت میں آواز بلند کرتا رہتا ہے۔ اس بنا پر وہ عورتوں کے حقوق کے متعلق بھی شروع سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے۔ چونکہ یہ بات ہماری مذہبی پیشوائیت پر سخت گراں گذرتی ہے کہ عورت کو مرد کے برابر حقوق دے دیئے جائیں۔ اس لئے، طلوع اسلام کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، اس میں یہ ''الزام'' بھی شامل ہوتا ہے۔

ذیل میں درج 18 فروری 2004ء کی ایک اخباری رپورٹ ملاحظہ فرمائیے اور خون کے آنسو روئیے:

> ''شمالی علاقہ جات کے ضلع دیامیر کے سب ڈویژن داریل میں حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے سات کمیونٹی سکولوں کی عمارات کو دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا گیا ان ساتوں پرائمری سکولوں میں علاقے کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں اور یہ سکول چھ سال قبل سوشل ایکشن پروگرام کے تحت قائم کئے گئے تھے۔ سیکرٹری تعلیم شمالی علاقہ جات کے مطابق ان علاقوں میں غیر ملکی امداد کو حرام اور لڑکیوں کی تعلیم کو خلاف شریعت سمجھا جاتا ہے۔ یہی عناصر ان دھماکوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے فوری طور پر ایسے افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ اس سانحہ کا

ایک توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ داریل کے مختلف دیہات میں قائم ان ساتوں سکولوں کی عمارتوں کو ایک ہی وقت میں دھماکے سے اڑایا گیا تاہم کسی جانی نقصان کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ سیکرٹری داخلہ شمالی علاقہ جات نے اس امر کی یقین دہانی کرائی ہے کہ اس واقعہ کے مرتکب افراد کو ایک ہفتہ کے اندر اندر گرفت میں لے لیا جائے گا۔ یہ افسوسناک واقعہ عین اس دن رونما ہوا ہے جب وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے کراچی میں اعلان کیا کہ حکومت نے ملک میں فروغ تعلیم کا تہیہ کیا ہے صدر مشرف تعلیم کو عام کرنے پر مسلسل زور دے رہے ہیں۔''

اس خبر کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمائیے کہ کیا ہم اس محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں جس نے جنگِ بدر کے موقعہ پر ان جنگی قیدیوں کو جو زرِفدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے یہ رعایت عطا فرما دی تھی کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو یہی ان کا زرفدیہ تصور کیا جائے گا اور انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے بچوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے ہیں اور دین نے کہیں ان میں تفریق کرنے کا حکم اور ہدایت نہیں کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صاحب طرز ادیب، شاعر اور قرآنی دانشور

فضل کریم فضل

کی

قرآنی موضوعات پر دانشوارانہ

تصنیف و تالیف

قرآن اور پاکستان

جس میں نظم و نثر کے حسین امتزاج کے ساتھ مندرجہ ذیل اہم موضوعات پر قرآنی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔

- ☆ دین میں جبر نہیں
- ☆ ہبوط آدم
- ☆ امام کیا ہے اور امامت کیا؟
- ☆ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے؟
- ☆ دین۔ اجتماعی نظام
- ☆ اسلام آگے چلا، یا نہیں؟
- ☆ تکذیب دین
- ☆ ہماری تاریخ میں کیا ہے؟
- ☆ دین اور مذہب
- ☆ فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟
- ☆ مذہب کی چیرہ دستیاں۔
- ☆ آزادی کا قرآنی مفہوم۔
- ☆ علامہ پرویزؒ
- ☆ پاکستان کا معمار اول
- ☆ عقیدہ وطنیت
- ☆ پاکستان

خصوصی رعایتی قیمت (علاوہ ڈاک و پیکنگ خرچ 250 روپے)

ملنے کا پتہ:۔ طلوع اسلام ٹرسٹ، 25 بی، گلبرگ 2، لاہور 54660۔

Email: trust@toluislam.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام' ایک زندہ نظام حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ' دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے' دین یعنی نظام حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں' اور اس کا اصل الاصول' امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصور اسلام کی رو سے' اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم' غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم' انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج' بھارت کا مسلمان' بایں ہمہ بے بسی و بے کسی' انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے' اپنی حکومت کا قیام' لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔ (مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں' (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (۲۲/۴۱)۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر' ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے' کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔۔۔ یعبدوننی۔ لا یشرکون بی شیاً (۲۴/۵۵)۔۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپؐ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپؐ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت' یعنی باغ و بہار آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔۔ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ۔۔ نعم النصر و التمکین فی البلاد۔۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)۔

اسلام کا تقاضا: یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظام حیات) بننے کا تقاضا' جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش

کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام' اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔'' (خطبہ الٰہ آباد۔۱۹۳۰ء)۔

اس سے بھی پہلے' انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے' مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں' عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ' ان قوانین کا از خود بہ طیب خاطر' اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

''اسلام' تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)۔

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدرآباد دکن' ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجۂ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ: آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ۔۔انا وجدنا اباء نا علیٰ امة و انا علی اثارھم مھتدون ۔(۴۳/۲۲)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا جاتا کہ۔۔۔اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیه اباء کم ۔۔ (۴۳/۲۴)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ و اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو' تو کیا تم

پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظام نو کی ضرورت نہیں۔۔حسبنا ما وجدنا علیه اباء نا ۔ (۵/۱۰۴)۔۔وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظام جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی' اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسولؐ اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ۔۔ولا ترکنوا الی الذین ظلموا۔۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا' توفتمسکم النار ۔۔تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا' ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات و تصورات زندگی' ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔لا الٰہ الا اللہ۔۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے' ہر شے کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل' عدم حرکت' جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ' قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے' اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص ۱۲)۔

اس قسم کی بت پرستی میں' ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں' ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم' اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے......اس سے تہذیب وترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص ۳۵۸)۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار وارادہ' اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے' اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی' اپنے اسلاف کی طرح' غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود' اپنے اختیار وارادہ اور فکر و بصیرت سے' تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے' محض تقلیداً کئے جائیں' تو یہ انسانی زندگی میں نشو وارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے' اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید!
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے' اپنا تعارف کراتے' یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ۔ انا انزلنه فی لیلة القدر۔ (۹۷/۱)۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو' جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے' ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔'' (خطبہ الہ آباد)۔

روشِ کہن: ہمارا مروجہ مذہب' ہماری شریعت' ہمارا کلچر' ہماری روایات' ہمارا فلسفۂ حیات' ہمارے رسوم ومناسک' غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں' عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دور عباسیہ) میں ہوا تھا' لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت' طریقت' تصوف' کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد' ان ''بتان عجم'' کو حریم کعبہ

سے نکال کر اسے خالصۃً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو ازسرنو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت: ''بتان عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ:۔

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوح سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرمﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ' ببانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا ۔کل شئی من امرجاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز: قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ۔۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر ۔ (۳/۱۰۹)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے' تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ

اس میں۔۔لا تملک نفس لنفس شیئا۔ و الامر یومئذ للہ (۸۲/۱۹)۔۔کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ کونوا عبادا لی۔۔(۳/۸۷)۔۔تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ۔۔مالنا ملک۔ بل لنا امیر ۔۔ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

''یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔''

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔کہ:

''یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔''

خلافت اور ملوکیت میں فرق: وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے' بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں' میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں' اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔''

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

''تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے

سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں: اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زینۃ الحیوٰۃ الدنیا (۱۸/۴۶)۔۔کہا ہے۔انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قرۃ اعین ۔ ۲۵/۷۴)۔۔کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔۔انما اموالکم و اولادکم فتنۃ ۔ (۸/۲۸)۔ یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔۔ ان من ازواجکم و اولادکم عدوالکم۔ فاحذروھم (۶۴/۱۴) ''یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔اس لئے۔۔فاحذروھم۔۔ان سے بہت محتاط رہنا۔۔قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھائی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہو گا۔بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہو گی تو اور کیا

ہوگا۔۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔ انکا دستور تھا کہ

''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ۔ ابن جوزی)

عدل: قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔ اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ۔۔ انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض۔ فاحکم بین الناس بالحق۔ و لا تتبع الھوٰی (۳۸/۲۶)۔ تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہو گا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد، یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)۔

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا' قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اوران قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں' نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات ومیلانات اثرانداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیلِ کار:

> اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی' نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔ (۲/۴۸)۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا' دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔۔''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔''(۵۵/۴۱)۔اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم' شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔۔وامتازو الیوم ایھا المجرمون (۳۶/۵۹) تا کہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم' مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔۔لا تکسب کل نفس الا علیھا (۶/۱۶۵)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔۔ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ (۶/۱۶۵)اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں' بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔اس باب میں' اور تو اور' خود حضور رسالتمآب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

> اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔(۶/۱۵)۔

اوراس کے بعد فرمادیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔فاطمہؓ۔بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے' ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی' پرائیویٹ مکان میں دی ہے' تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر' اسے ازسرِنو پبلک میں سزا دی۔۔جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو' تو آپ نے گورنر' اس کے بیٹے' اوراس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا' کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی' آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد' آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیرالمومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم وتربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو' خود خدا کا قانون مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا

ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ (۱۹/۴۰)۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ 'حسبِ دستور' افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر' ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی' کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو' خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے' جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟: لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہو گی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔۔ کان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۴۸/۲۷)۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں' امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ۔۔ ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا۔۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔۔۔ واتبع ھوٰہ۔۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وکان امرہ فرطا (۱۸/۲۸)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں' تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا' سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو' تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے' تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے' کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے' تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔۔ حضورؐ نبی اکرم نے خود فرما دیا کہ انا اول المسلمین۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی' وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے' آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس: یہ تھا عدل۔۔ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی' سوشلزم کی طرح' ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔ Due) کا تعین' پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principales) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں' یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے' اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے' وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین' معاہدات' رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی

معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق' الوہیاتی معیار موجود ہے' ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہو گی۔

(Justice and The Social Order)

رزق کا حق: قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ' از روئے قوانین خداوندی حقدار ہے' عدل کہلائے گا اور یہ قوانین' قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے' ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے' ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

(مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (۶/۱۱)۔

قرآنی مملکت' جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے' خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

(مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ (۶/۱۵۲)۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجۂ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے' رفاہی ہے یا اشتراکی۔۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہوسکتی ہے۔۔ یعنی تمام افراد معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا' اور' جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے' یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ' زمین ہے اور قرآن کی رو سے' زمین پر۔۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ' انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ اسے قرآن نے سواء للسائلین۔ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی

زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ۔۔ لنا رقاب الارض۔۔ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربوٰ کا مفہوم: زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصول دولت کا ہے۔ عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے، ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس، ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ۔۔ وذروا ما بقی من الربوٰ۔۔ ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ۔۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا و رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔ (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربوٰ کا مرتکب، اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ (۵۳/۳۹)۔۔ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی، جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲/۲۱۹)۔۔ ''تم سے پوچھتے ہیں کہ

ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے' سب کا سب۔'' اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یارسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔(حاکم)

دولت کی تقسیم: کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں' سوشلزم کا نظام رائج ہے۔اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔اس میں شروع میں مال غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسولؐ اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادہ شدہ کو دگنا حصہ' کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔اس کے بعد جب افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افراد معاشرہ کو رزق۔۔یعنی سامان زیست۔۔مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا' جس میں کیفیت یہ ہو کہ۔۔الا تجوع فیھا ولا تعریٰ۔ و (انک) لا تظمئو فیھا ولا تضحیٰ (۱۱۹۔۱۱۸/۲۰)۔۔نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامان آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ولباسھم فیھا حریر (۲۲/۲۳)۔۔نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔۔ثیابا خفرا من سندس و استبرق۔ (۱۸/۳۱)۔۔دبیز ولطیف ریشم کے زرکار پردے۔۔ سور موضوفۃ۔۔مرصع اور نرم ونازک صوفے۔افیۃ من فضۃ و اکواب کانت قواریرا (۷۶/۱۵)۔۔چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔غرضیکہ۔۔نعیما و ملکا کبیرا۔۔(۶۷/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامان آسائش نہایت فراواں۔اور پھر یہ سامان آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فرد معاشرہ کے لئے یکساں۔قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائے۔اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔اس میں سب کا معیار زندگی اتنا

بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس ونکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔ اور نکبت وافلاس سے پستی ودنائت کے انسانیت کش عیوب وزمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراط زر ہوگا نہ افلاس وزبوں حالی' تو ظاہر ہے کہ اس میں' ان سے پیدا ہونے والے عیوب وذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔ حسد' کینہ' انتقام' تنگ نظری' حرص' ہوس' فریب کاریاں' مکاریاں' سازشیں۔۔ اور دوسری طرف بے حمیتی' بے غیرتی' ذلت نفس' تملق' خوشامد' منافقت وغیرہ' یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان' وجۂ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثما۔۔ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے' نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی واضمحلال پیدا ہو۔۔ الا قیلا سلاما سلاما (۵۶/۲۵-۲۶)۔ اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز وآہنگ جاں افروز سناتی دیتی ہے۔۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل (۷/۴۳) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان' غلط معاشرہ میں' دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؔ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب
راز دانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است
از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو!
حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ
از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش!
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبالؔ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

ان هذه امتكم امة و احدة و انا ربكم فاعبدون۔۔ (۲۱/۹۲)۔۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلاوہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔۔ ما كان لبشر ان يؤتيه الله الكتاب والحكم و النبوة ثم يقول للناس كونوا عبادا لى من دون الله (۳/۷۸)۔ اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء، خود اربابِ نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

> اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضورؐ نبی اکرم کا یہ ارشاد گرامی کہ

> جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن و خوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

> یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ، اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولائیت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی، جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔۔ عبداللہ۔۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

> سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے، کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں

پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہی۔ یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد' زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہوسکتا۔ اس میں' تمام افراد مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی' کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا' اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے: اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے' اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسمیں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور' ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا' تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا' اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد' اس کے زور بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؔ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے' تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے' چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں' اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں' کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے' محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ' وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان' معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان' کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔ (۲۳/۵۱)

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا' تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا' وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔ وکلا منھا رغدا حیث شئتما (۲/۳۵)۔۔ وہ جہاں سے جی چاہتا' پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے' تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ۔۔

یخرجنکما من الجنة فتشقیٰ (۲۰/۱۱۷)۔۔وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا' جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بعضکم لبعض عدوا (۲۰/۱۲۲)۔۔کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے' آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد: قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ۔۔ویضع عنهم اصرهم و الاغلال التی کانت علیهم (۷/۱۵۷)۔۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا' جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی' اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل' وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں' ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ۔۔انا بشر مثلکم ۔۔اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر' یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے' انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار' شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو' اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

> پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ'' چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار' اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن: وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا جس سے

اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ۔۔لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔۔ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔۔یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھلسنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ۔۔الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ۔۔کس قدر قابل حمد وستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔۔الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب (۳۵۔۳۴/۳۵)۔ وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین ۔۔سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے والا۔۔جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی

بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف وتوصیف قرار نہیں پاسکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوار حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۷)۔ ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے، تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ۔۔لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (۹/۷۶)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے، ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا، ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا، نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ۔۔یقسم المال صحیحاً۔۔وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ۔۔بالسویۃ بین الناس۔۔تسویہ کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ استوی الرجل۔۔کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃ کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

> لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت وامامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ

> کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
> مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین وجمیل پیکر ہوتا۔۔

لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز' اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے' اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

واتل علیھم نبا الذی اتینٰہ اٰیاتنا

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے۔لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ان ہولناکیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ' تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذالک مثل القوم الذین کذبوا باٰیٰتنا۔یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔۔ فاقصص القصص لعلکم یتفکرون ۔۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ' شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔ساء مثل القوم الذین کذبوا باٰیٰتنا ۔اف! کس قدر بری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔لیکن نہیں سوچتا کہ۔۔و انفسھم کانوا یظلمون ۔۔وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں' خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لھم قلوب لا یفقھون بھا ۔وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا ۔وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔۔ولھم اذان لا یسمعون بھا ۔۔ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔۔اولٰئک کالا نعام ۔۔تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔یہ انسان نہیں' حیوان ہیں۔۔بل ھم اضل ۔۔نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔۔اولٰئک ھم الغافلون (۷/۱۷۹)۔۔حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا' اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از عبیداللہ سندھی (مرحوم)

شاہ ولی اللہ کا تدبر فی القرآن

شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی (حیدرآباد) سے شائع ہونے والے ایک ماہنامہ ''الرحیم'' کی پہلی اشاعت میں مولانا عبیداللہ سندھی (مرحوم) کا مرتب کردہ شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کا تعارف شائع ہوا ہے تھا جس میں قرآن کریم کے بعض نکات کی' شاہ صاحبؒ کی تشریحات بڑی بصیرت افروز ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

(الف) آیات متشابہات

''قرآن مجید کی آیات محکمات و متشابہات کے متعلق ایک عرصہ دراز سے جو ذہنی الجھاؤ آ رہا تھا شاہ صاحب نے اسے دور فرمایا۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا ہے اور عام طور سے اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں لیکن اس ضمن میں دقت یہ ہے کہ آیات متشابہات کی کوئی ایسی متفقہ علیہ واضح تعریف نہیں جس کی بناء پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ فلاں فلاں آیات محکمات ہیں اور فلاں فلاں متشابہات ہیں جن میں کہ گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ متشابہات کے غیر معین ہونے اور ان میں بحث کو ناممکن سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ ایک تو سارے کا سارا قرآن قابل فہم نہ رہا۔ دوسرے متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ ہو جائے کہ اس کے بعض حصے اور طرفہ بات یہ ہے کہ ان بعض حصوں کا تعین بھی نہ ہو' فہم سے بالاتر ہیں تو متوسط عقل رکھنے والوں کے لئے ساری کی ساری کتاب مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کی تعلیمات اور احکام کے بارے میں وہ عزم و یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو عمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

''شاہ صاحب نے اس غلط فکر کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی اور راسخین فی العلم کے لئے آیات متشابہات کے معنی کا تعین ممکن ثابت کیا''۔

(ب) شانِ نزول

''قرآنِ مجید کا خطاب ساری انسانیت کو ہے اور اس کی دعوت میں پوری عمومیت ہے اور گو ائمہ فقہا نے اصولِ فقہ میں بالاتفاق اس امر کی صراحت کی ہے کہ اگر قرآنِ عظیم کی کوئی آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کی شانِ نزول کے متعلق کوئی خاص واقعہ ذکر کرتے ہوں لیکن قرآنی مطالب کی تشریح میں بہرحال عمومیت ہی مدنظر رہے گی اور کسی خاص شخص یا واقعہ سے اس آیت کو مخصوص کر دینا محلِ اعتبار نہ ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قاعدے پر سب کا اتفاق ہے لیکن عملاً قرآن کی آیات کو مخصوص اشخاص اور واقعات سے مختص کر دینے کا دستور ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ عام اساتذہ اور طلباء کو انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا

ہوا پائیں گے۔ قرآن عظیم کو عملاً آیات احکام تک محدود کر دینے نیز اس کی آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزئی واقعات سے مختص کرنے کا اثر یہ ہوا کہ قرآن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی میں موثر نہ رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ ہماری تمام عملی سرگرمیوں میں مشعلِ راہ بنتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ محض پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' کی ابتداء میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ آیاتِ احکام کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عام بنی نوع انسان میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ ان آیات کا سبب نزول ان کو سمجھنا چاہئے۔ یہاں کسی زمانے اور قوم کی تخصیص نہیں' عرب ہوں یا عجم' آج کا زمانہ ہو یا کوئی پہلے کا گزرا ہوا دور' جہاں بھی یہ خرابیاں پیدا ہوں گی قرآن کی ان آیات کا انطباق ان پر ہوگا اس ضمن میں ''الفوز الکبیر'' کی عبارت ملاحظہ ہو۔ ''تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ جہاں بھی برے اعمال اور ظلم کا وجود ہوگا۔ وہ ان آیات کا سبب نزول سمجھا جائے گا۔''

(ج) اقتصادی توازن

''شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب قوموں کو اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے' زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے حیوانی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیب نفس کے ذریعہ اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور سے موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لئے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اخلاق کی یہ تکمیل ہی اسے جنت کا حق دار بنائے گی اور اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رویت سے بہرہ ور ہو۔

اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لئے ایک فطری چیز بن جاتی ہے نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں۔''

(د) کفر کے فتویٰ کا ڈر

(مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں)۔

''قرآن کی آیات ہی کے ضمن میں ایک اور مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ علماء کے نزدیک قرآن کی بعض آیات ہیں جو دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس مسئلہ میں مزید الجھن اس بات سے بھی ہوئی کہ اہل علم متفقہ طور پر فیصلہ نہیں کر سکے کہ قرآن مجید کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے۔ ایک عالم ایک آیت کو منسوخ قرار دیتا ہے اور دوسرا ہے کہ اس کی تنسیخ کا قائل نہیں۔

شاہ صاحب نے ناسخ و منسوخ کے مسئلہ کو اطمینان

بخش طریقے سے حل کیا۔انہوں نے صرف پانچ آیات کو منسوخ مانا ہے لیکن اس میں بھی ان کی حکمت ہے تا کہ معتزلی ہونے کا الزام نہ لگے۔ ورنہ ان پانچ آیات کا بھی منسوخ نہ ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا اصل مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید میں سرے سے کوئی آیت منسوخ ہی نہیں۔

طلوع اسلام:-

آپ نے غور فرمایا کہ مذہب کے اجارہ داروں نے کس طرح حق گوئی کا گلا گھونٹ رکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ جیسی شخصیت بھی یہ بات کھل کر نہیں کہہ سکتی کہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ انہیں بھی اس حقیقت کے اعلان کے لئے حکمت عملی سے کام لینا پڑا۔ اگر یہ گروہ جو ازل سے دین و دانش کا دشمن اور علم و بصیرت کا حریف چلا آ رہا ہے' انسانیت کے سینے پر کابوس بن کر سوار نہ رہتا تو کیا معلوم اس وقت تک کائنات کے کس قدر رموز اور قرآن پاک کے کس قدر حقائق بے نقاب ہو چکے ہوتے۔ غور کیجئے کہ یہ لوگ علم و بصیرت کے راستے میں کتنی بڑی روک بن کر کھڑے ہیں۔

لیکن اب یہ زیادہ عرصہ تک روک بن کر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں راستے سے ہٹا کر رہیں گے۔ خوشا بخت ہیں وہ قومیں جنہوں نے اس باب میں سبقت کی ہے۔ وہ اسی نسبت سے باقی اقوام سے آگے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام وابستگان وقارئین کرام ماہنامہ طلوع اسلام

ایک بزعم خویش ہر دلعزیز بادشاہ نے اپنے محل کے پچھواڑے نہانے اور تیرنے کے لئے تالاب تعمیر کروایا۔ ایک دن اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس تالاب کو دودھ سے بھر کر انجوائے کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے رات کو سارے شہر میں منادی کروادی کہ کل صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے گائیوں، بھینسوں اور بکریوں کے مالک ایک وقت کا دودھ بادشاہ سلامت کے تالاب میں ڈال آئیں تاکہ ان کی آرزو پوری ہو سکے۔ ہر دودھ دینے والے جانور کے مالک نے یہی سوچا کہ اگر میں نے دودھ نہ ڈالا تو تالاب خالی تو نہیں رہ جائے گا۔ لہٰذا کسی ایک نے بھی دودھ نہ ڈالا۔ رعایا کی مصنوعی اطاعت اور وابستگی کے نتیجہ میں تالاب خالی کا خالی رہ گیا۔۔۔ چیئرمین محترم ایاز حسین انصاری اور نمائندہ بزم طلوع اسلام، لاہور محترم محمد اشرف ظفر صاحب کی طرف سے متواتر تین سال کی اپیل کے بعد طلوع اسلام فروری 2004ء کے شمارہ میں تہنیت باد! پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور ساتھ ہی ہم سب قارئین طلوع اسلام کی وابستگی نے بادشاہ کے تالاب کی بات دوہرادی۔

میرے محترم ومعزز ساتھیو! اپنی کمائی میں سے کچھ حصہ ایسے صحیح مقصد کے لئے خرچ کرنے کے مواقع بار بار نہیں آیا کرتے۔ اس پلان کی تکمیل کے لئے اب تو صرف بارہ یا پندرہ بالٹی دودھ درکار ہے۔ اگر ہم سب ایک ایک بالٹی کی بجائے صرف ایک ایک گڑوی، گلاس یا کپ اپنی کمائی میں سے ہر مہینے طلوع اسلام کے بلڈنگ فنڈ میں جمع کروانا شروع کر کے صدقہ جاریہ، قرآنی تعلیم کے حصول اور نشر واشاعت، نظام خداوندی کے قیام واستحکام کے لئے جدوجہد یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہو جائیں تو ایک سال کے اندر یہ قرآنی درس گاہ اور لائبریری پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ حسب استطاعت وتوفیق آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

کندھے سے کندھا ملانے کا خواہشمند

غلام باری مانچسٹر (برطانیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

〈لغات القرآن〉

ق ص ص

قَصَّ اَثَرَہٗ یَقص قصا و قصصا ۔کسی کے پیچھے پیچھے اس کے نقوش قدم پر چلنا*۔ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوتے ہیں۔قرآن کریم میں دیکھئے (۶۴/۱۸، ۱۱/۲۸)۔

قص علیہ الخبر قصصا۔ اسے وہ خبر بتا دی۔اسے اس پر مطلع کر دیا*۔قرآن کریم میں ہے۔نحن نقص علیک احسن القصص (۱۲/۳)۔ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں۔القصاص۔ قصہ گو۔ ایک حدیث میں ہے ان بنی اسرائیل لما قصوا ھلکوا۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے۔یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو ہلاک ہو گئے*۔(یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا)۔ القصۃ۔ معاملہ۔خبر۔واقعہ*۔

قص الشعر۔ اس نے بال کاٹے۔المقص۔ قینچی کو کہتے ہیں*۔

القصاص۔ مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے۔مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے دینا۔ قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ) کا آنا کئے ہیں۔قرآن کریم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے کہہ دیا کہ من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکا نما قتل الناس جمیعا۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً (۵/۳۲)۔اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے، یا ملک میں فساد برپا کر دے، اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق

---

*تاج

(۵/۳۳) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کتب علیکم القصاص فی القتلی (۲/۱۷۸)۔ ''تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے''۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' قصاص کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔ لہٰذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب یاایھا الذین امنوا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں' اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ''قابل دست اندازی پولیس'' قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs.....)۔ لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو' بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے' خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے' خواہ قاتل' مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے' جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فمن عفی لہ من اخیہ شیء فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان ذالک تخفیف من ربکم و رحمۃ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے چاہئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے

کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ''کچھ معاف کر دینا''۔ (شی) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ''کچھ معاف کر دینے'' (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ''کچھ معاف کر دینے'' کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا' مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیّتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے ماکان لمومن ان یقتل مومنا الا خطا۔ کسی مومن کے یہ شایان ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ ومن قتل مومنا خطا فتحریر رقبة مومنة ودیة مسلمة الی اھلہ الا ان یصدقوا۔ ''اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر' بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں' بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے' مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فمن عفی لہ من اخیہ شئ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خوں بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقی ماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہو گی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ' جھنم خالدا فیھا و غضب اللہ علیہ ولعنہ و اعدلہ' عذابا عظیما (۴/۵۳)۔ اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے' اور اس کی لعنت اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے''۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خوں بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائے گی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیرت میں آ کر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہو گی۔ جرم کی نوعیت اور احوال وظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہو گا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جزائوہ' جھنم کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور۔ قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے یہی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم'

موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے فلا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ فمن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطنا۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں' اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں' مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو ''سلطان'' بنایا ہے۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا۔ انہ کان منصورا (۱۷/۳۳)۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فلا یسرف فی القتل۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ (ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ''اسراف فی القتل'' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فقد جعلنا لولیہ سلطنا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم' معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہٰذا فلا یسرف فی القتل کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

(۱) ومن قتل مظلوما سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً' نادانستہ' بھول چوک میں' غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہٰذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

(۲) معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا' اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار بنے گا۔

(۳) قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فجزائہ جہنم سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور ''اللہ کا غضب ولعنت اور عذاب عظیم'' وغیرہ اس کے ساتھ' یا اس سے الگ' یا اس سے نچلے درجہ پر' دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے:

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل' افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہٰذا' مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا' مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا)

تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خوں بہا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کردیں یا خوں بہا کی رقم میں سے کچھ کم کردیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ ''کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کردے۔ مگر غلطی سے''۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے' قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن کسے باشد' ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۵/۳۲)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کردے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خوں بہا ادا کرنا ہوگا تاکہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کردے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی قدر و قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جاسکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو' یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر' یا دشمن سے جنگ میں' یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے' وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ افراد از خود) کہ بالحق کسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مقتول مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کردیں۔ یہ ہے وہ قصاص جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (۲/۱۷۹)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حسن نثار

''ملا مائینس موومنٹ''

سب سے پہلے ناقابل یقین قسم کا یہ خط ملاحظہ فرمائیے

''محترم حسن نثار صاحب!

اسلام علیکم!.....ابھی ابھی میری فون پر آپ سے بات ہوئی' امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے' آپ کا طویل انٹرویو (ماہنامہ ''سپتنگ'') کے حسن نثار نمبر سے'' پڑھنے کے بعد میں نے حضرو کے دو تین مذہبی مدرسوں میں جا کر وہاں کے حضرت صاحب اور مولوی صاحبان سے عرض کیا کہ مجھے حضورؐ کا خطبہ حجتہ الوداع چاہئے' آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان حضرات نے کہا کہ میں ان کی ''نگرانی میں مدرسہ کے اندر بیٹھ کر خطبہ حجتہ الوداع پڑھ تو سکتا ہوں لیکن لکھ نہیں سکتا' نقل نہیں کر سکتا' آپ سے گذارش ہے کہ جلد از جلد مجھے خطبہ حجتہ الوداع کی نقل بھجوا دیں جو آپ کے گھر میں موجود ہے۔''

شکریہ والسلام

امیر تیمور معرفت بنیامین اینڈ سنز

جنرل سٹیشنرز کوٹلہ بازار حضرو ضلع اٹک

قارئین!

میں نے اس نوجوان کو حضورﷺ کے تاریخی بلکہ تاریخ شکن اور تاریخ ساز خطبہ حجتہ الوداع کی نقل بھجوادی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ میرا بھیجہ ہل گیا' اس ملک کی ملائیت کس طرح سے پاپائیت اور برہمنیت کے سانچے میں ڈھل رہی ہے اور حضرت علامہ اقبالؒ کا اصل ہدف یعنی پیشہ ور ملا مکمل ترین ضابطۂ حیات دین اسلام کے نام پر ''اجارہ داریاں'' قائم کر کے کیا کیا کر رہا ہے' ان ''حضرتوں'' کو تو خوش ہونا اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ حضرو جیسے پسماندہ علاقہ میں ایک نوجوان خطبہ حجتہ الوداع جیسے عظیم ترین پیغام کی تلاش میں آیا ہے لیکن.....

علامہ اقبالؒ زندگی بھر یونہی نہیں کڑھتے رہے ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

☆☆☆

ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
دین ملّا فی سبیل اللہ فساد

☆☆☆

گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار

☆☆☆

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

☆☆☆

قوم کیا چیز ہے' قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

☆☆☆

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

☆☆☆

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

''قم باذن اللہ'' کہہ سکتے تھے جو' رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

☆☆☆

وہ مذہبِ مردان خود آگاہ و خدا مست
وہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات

☆☆☆

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے؟
یہ پیران کلیسا و حرم' اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

قصہ مختصر کہ مختصر ہی بھلا..... اقبالؒ کا سارا کلام پیشہ ور ملائیت کے خلاف بغاوت سے بھرا پڑا ہے لیکن نہ ہمیں کل سمجھ آئی تھی نہ اب آ رہی ہے۔ 17 فروری کے ''جنگ'' کی یہ خبر بھی میرے تازہ زخم پر نمک بن کر گری کہ'

''شمالی علاقہ جات میں لڑکیوں کے 7 سکول دھماکے سے اڑا دیئے گئے۔''

''داریل اور تانگیر میں لڑکیوں کی تعلیم خلاف شریعت سمجھی جاتی ہے: سیکرٹری تعلیم''۔

پنجاب میں اگر کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ سیاستدان اور نوجوان ارکان اسمبلی ایم ایم ایم (ملّا مائینس موومنٹ) کے نام سے ایک فکری تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں تو شاید یہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے' ابتدائی اور مرکزی خیال یہ ہے کہ نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان دینے سے لے کر اپنے بچوں کے نکاح پڑھانے اور نماز جنازہ کی امامت تک ہر کام کے لئے مولوی بلانے کی بجائے مسلمان باپ' تائے' چاچے' مامے یہ سارے فرائض خود ادا کریں تا کہ مسلمان معاشرے میں پیشہ ور ملّا کا رول بتدریج کم ہو سکے.....

قرآن اور مسلمان کے درمیان حائل دیواریں گرائی جا سکیں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ' ۱۸ فروری ۲۰۰۴ء)

مقصُودِ اقبالؒ

اسد ملتانی

کہا اقبالؔ سے اک ہمنشیں نے
سخن تیرا شرابِ آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دے دِل
کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی
کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پرورں عصر
مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز
کشش میں نغمۂ خُلد بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا
دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبالؔ بولے
فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا
فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز
ادب پرورِ روحُ الامیں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے
سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی
''چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے''
میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا
اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف
مری نظروں میں قرآنِ مُبین ہے
گذر جانا مری بزم سخن سے
رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے
تو حاصلِ دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

سانحہ ارتحال

بصد افسوس اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام برمنگھم کے سابق نمائندہ چوہدری محمد سلیمان بروز جمعرات یکم جنوری 2004ء بوجہ عارضۂ قلب اس دارافانی سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے 75 سال کی عمر پائی۔ ان کے پسماندگان میں بیگم صاحبہ کے ساتھ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کا تعلق موضع سملوٹھہ تحصیل نیوڈ ڈیال ضلع میر پور آزاد کشمیر پاکستان سے تھا۔ آپ برطانیہ کے شہر برمنگھم میں 45 سال سے علاقہ ایلم راک میں مقیم تھے۔ آپ کی خدمات بزم طلوع اسلام برمنگھم کے لئے 1968ء سے تامرگ مختص رہیں۔ مرحوم نے اپنی ادبی صلاحیتوں کی بدولت دو کتب بعنوان ''جہاں بینی'' اور ''جہان ادب'' تصنیف کیں۔ یہ کتب ان کے قرآنی مضامین اور شعری مجموعہ پر مشتمل ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

عزۃ القرآن

ملنے کا پتہ :-

(1) کتب خانہ شرکت الامتیاز، غزنی روڈ، اردو بازار لاہور۔

(2) ادارہ طلوع اسلام، B-25، گلبرگ 2، لاہور۔

(3) احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی۔

(4) مکتبہ ضیائیہ، بوہڑ بازار، راولپنڈی۔

(5) باغبان پبلشرز، سنبل سیداں، نیومری۔

Response to a Muslim Lady's defence of 'religious' Hijab

By
Rashid Samnakay

==========

My Dear Sister Mehra.

You took umbrage to my reference in the sentence to Hijab as a show of piety and the cleavage as a sensual fashion. I was, sarcastically perhaps, trying to establish that to me they both are expression of fashion, and no dress Arab or not, is reverential, hence the expression such as 'doubled up fan belt on the Arab head dress' by our friend.

The French, Turkish and other Governments' attitude to Muslim women's head cover is naïve and foolish. They are scared of the expression and the exercise of the Muslim women's right to make political statements and protests. As I tried to argue that in fact the Skull-cap and the Cross are more religious than the Hijab. I now add the Sikhism's Turban in the religious category.

The Scarf has been a part of lady's dress from time immemorial. Historically it was a status symbol of the upper class ladies among the Romans, Greeks, the Persians etc. It is not a new invention of 'Muhammadan' era; nor of modern times. It is a hand-me-down apparel of Judeo-Christianity.

We have discussed the Universal cultural-atiquette of young women of the Subcontinent where they cover their heads as sign of respect for the elders, irrespective of the gender and Religion.

Let us consider the subject and my understanding of the issues in the light of Quran. However I am willing to be corrected. I contend the following in reference to it as brought by our Rasool. The superscripts are only one reference, often out of many:-

- Khimaar-(khumurihinnaa[24-31]=their scarves) is just that, a piece of cloth. It could be Dupattaa, Orhnee, Mantle, Shawl, Jilbaab[33-59] and any of the other various names given to such material to cover such parts of the body that would display sensuality.
- I believe that Quran, in recognising the difference between male and female anatomy and certain aspects of sensuality, has made a "paradigm shift" in the usage of the scarf from it just being a dress accessory; to the meaningful covering of the female bosoms (juyubihinnaa)[24-31], for obvious reasons.
- I also believe that it is Hadis and the male-clergy (priest hood), who linked the scarf specifically to HAIR, and not the part of the female body that Quran puts the emphases on.

- Hair (She'run)[16-80] is mentioned in Quran in respect to the gifts God has provided in animals such as their fleece, hair for spinning wool[16-80], not in respect to human hair.
- The Muslim clergy (the Muslim-Church) is riding the bandwagon of Religious Hijab to bolster their position and now by playing politics with it.

We therefore believe, Quran has never meant Hijab as a means of hiding the hair on the head of a woman or a man for that matter.

We ask that if a 'Muslim' woman is to be covered from head to toe (alas! a separate topic), then what is the necessity of this extra thing called Hijab, the hair covering?

We also contend that if the hair was so dirty and sensuous that it has to be totally covered in the name of the 'religion' then, men with 'religious' beards should also cover their faces in Niqaab/Burqaa! Or else shave their head and face at least once daily if not five times in the name of religion.

We conclude that according to Quran;

1. The seven places the word hijab [(7-46,17-45,19-17,33-53,38-52,41-5,42-51)] occurs in Quran, it alludes to the aura of separation, the protocol, decorum, barrier etc. For example, God spoke to Rusul from behind a Hijab, there was a hijab between the people in hell and the people in heaven etc. The political metaphors of **'Iron' and 'Bamboo'** curtain are an example, without the physical curtain.
2. Within the **Code** of Islam, the **responsibility** of not only dressing **modestly** but, ***behaving correctly***, falls ***equally*** on ***Muslim male and female*** [4-124] gender. In fact the Male [24-31,32] is addressed first in the verses. In our 'religion' the female carries all the responsibility of the male's morality and his sins!(Remember Amina Lawal of Nigeria?- and cases in NWF)
3. Showiness and ***overt display*** [24-31] of one's ***piety*** [107-6] is frowned upon. It is this last aspect, when examined critically by us, irks many a 'good' Muslims for they realise rightly as their "religion" and their "piety" is being questioned.
4. Islam prescribes **code** of dress and not a **mode** of dress. Every decent dress, creating that aura of **modesty and decorum**- that curtain without a curtain; both for men and women is an **Islamic dress** irrespective of cultural differences and styles. Middle Eastern mode/style of dress is no more reverential and **holy** than the well attired Lungi/Kameez of Bangal and Burma, Kimono of Japan, Sari of India, Busuti of Uganda, Bueebuee/Kanju of Kenya, Banju Kurong/Todong of S.E Asia, Shalwaar/Kurtaa/Duppattaa of Pakistan etc.
5. Dress should be such as **not to draw attention** to your self so as be not molested33-59. Couple of sizes smaller, body-hugging attire accentuating one's body contours falls into that category.(you told me that in the Subcontinent, males brazenly molest ladies in streets, what ever the dress! This is confirmed in the book 'the Holy Cow'. See below.)

6. The only other dress alluded to in general is the Ehraam-pilgrim's garb [5-3] for Hajj purposes only. - the word Ehraam is not in Quran.
7. *Zeenat* [7-32], adornment and personal enhancement is acceptable to Quran.

The fact is that instead of a simple dress accessory, today Hijab has become a form of **demonstration** (a flag) of our Muslim **ethnicity**; to some even of **piety** and in today's environment a statement and **protest**, and in combination of the above, a fashion design.

It is admitted that the head scarf turns any woman, even a tramp, in to a **lady**. But no particular mode/style of dress is given in Quran and therefore none is holy. All over the Muslim world Design/fashion houses are springing up. Because Muslim women are no less fashion conscious than others and there is nothing wrong in that except for masking the fashion behind Islam to *trading in the aayaat for meagre returns* [2-79].

I also admire you and your kind who have the guts to express themselves for what they are and feel. It is about time our women to take part in what affects their lives as Muslims and not what the males have imposed on them in the name of religion. *Free will* [2-256] is the concession of Islam within the prescribed Code of behaviour, and that along with the requirement of *takreem* [17-70]- dignity- forms the basis of the **equality** of mankind; including that of women. Take active part in the matter of Islam in a positive manner, not just as a second-class citizen and not be dictated by the other gender, for we *have rights over* [2-228] each other! These rights extend to all walks of life, including politics.

Islam is not just **an Arabic religion** or of any particular region, it is **universal**, for the whole of *annaas* [3-110] i.e. human. So, we must resist any body who want to hijack it to 'their' region, for 'their' religion or for 'their' vested interests.

Dear Muslim Sister, you as an educated and an enlightened person have every right to wear what ever you like. Only that as a Muslim, **we all** have to be Modest and decent (that is non-sensual) in our dress and you know that too. All such decent dresses are **Islamic**. That is all people like me are saying. Any addition to and subtraction from Quran is Shirk even for good politics.

However I remember and cherish your advice which is endorsed by Quran to *"discuss with them in most aahsan way"* [16-125]. To **agree to disagree amicably** is the requirement of intellectual discourse. Quran has the oft repeated exultation of *afalaa tadabbaroon*. [47-24]- why don't you contemplate- and *even to question it!* [25-73] . I have not said any thing out side the ambit of Quran. I believe that you are quite capable of looking out for additional references in it. Please over look my weakness and keep on correcting me.

Salams to all of you and our love to the young ones in the family. Rashid

Also see the following:-

Sarah Macdonald –'Holy Cow, an Indian Adventure' – p 124

"I hunt for the passages on women and dress codes, but I find only that Mohammed urges women to guard their modesty. I also read that Quran advises men they shouldn't wear tight clothes across their genitals. I can't help but note there's still a lot of stretch denim in town."(after all she is an Australian!)

****

We also observe that if human effort is added to the schemes of nature then the period that natural process alone would take is considerably reduced. Besides, the grace, the beauty, the utility and the longevity of that thing are enhanced. For example: in the laboratories of Europe scientists have shown that the maturing period of plants can be considerably reduced. They have converted plants that in natural process take six months to bloom out flowers and that too of one color into plants that take just twenty-four hours to bloom out flowers and that too of four colors. So if human effort is added to the natural process then the creative process of the Divine increases its speed and beauty is also added to the emerging result.

Similarly the Divine Laws are applicable in the human world. The Qur'an says:

بَلْ نَقْذِفُ بِٱلْحَقِّ عَلَى ٱلْبَـٰطِلِ فَيَدْمَغُهُۥ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ

Bal naqzifu bil-Haqqi alal-baatili fa-yadmaguhuu fa-izaa huwa zaahiq (21: 18)

"In the universe true and false are at loggerheads. The truth defeats and crushes the wrong. In other words the constructive forces defeat the destructive forces and in this way the universe keeps marching forward by gradually completing its evolutionary stages." This is the Law of Nature. One evolutionary stage might take thousand or fifty thousand years to complete. The Qur'an says that one day (stage) of Allah is of thousands years (22: 47) and of fifty thousands years (70: 4) of our reckoning. But if human effort is added to the creative process of the Divine then duration for the Truth to emerge victorious (or for one evolutionary stage to complete) might reduce to just few days. But only those persons can be co-creators with the Creative Activity of the Divine who have unflinching faith in the truthfulness of the Divine Laws and those who develop their Personality by keeping before them the Divine attributes as Standard. This is belief in Allah and this is doing good deeds.

Individual and Society

When such people combine to form a group then it is called *Jamaat-e-Momineen* or *Hizbullah* or party of God. Owing to this party a society is developed in which the Divine Laws become result-oriented in a very short span of time. In this way Human Personality of the individuals of the society keeps on developing. The Qur'an has unambiguously stated that Human Personality needs a society (the Qur'anic society) for its development and it cannot develop individually or in isolation. While addressing an individual it says:

فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى ﴿٢٩﴾ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ﴿٣٠﴾

Fadkhulii fii Ibaadii wadkhulii Jannatii (89: 29-30)

"If you want to enjoy the life of eternal bliss then become a member of the party of Allah because the primary condition for eternal life is to be with the truthful, كُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ *kuu-nuu ma-as-Saadiqiin* (9:119)." Owing to this reason private

closets of monasteries and lonely corners of a hermit' abode have been considered as unnatural by the Qur'an. They are against the ***Deen*** of Allah. The ***Deen*** of Allah is established in a society and not outside of it. ***Deen*** provides rules and norms for mutual relationship between men. If a man goes to live alone in a jungle then he does not require ***Deen***. Besides, he does not have an urge to believe in Allah. His Personality will not develop. He will not contribute for the elevation of human life. In short he cannot lead a life at human level. As such ***Deen*** is desirous of assemblage and an individual can develop his Personality only in a society.

Establishment of a Community

Two men decide to follow one ideology. They have similar objectives and goals. The way they want to lead their respective lives is also not different. Then it is natural that they would essentially share similar feelings for each other. This is called unity of thought and vision or commonality of *Eiman* (Conviction), believing in the Divine Laws with reason and knowledge.

According to the Qur'an this unity of thought and vision is the basis of *Jamaat*, party. In other words two men of any color, of any language, of any race, of any nation and living anywhere in the world are members of one party and individuals of one community if they develop their respective Personalities by keeping before them as Standard the Divine attributes. The Qur'an has suggested only this measure for the establishment of a community. The unity developed amongst human beings in this way is much stronger and lasting than the ties of blood, color, language and nation.

Unity of Humanity

If this type of commonality keeps on spreading amongst men then a universal community of all human beings would emerge. This shows that the end result of keeping the Divine attributes as Standard is unity of humanity. Apart from this there is no other way of establishing unity amongst human beings. The objective and goal of the Qur'an is that gradually all men should start keeping in their practical lives the Divine attributes as Standard and thereby form one universal brotherhood of human beings. In this way all those disputes and conflicts would come to an end owing to which this world has become a cell of beasts.

Belief in God

What idea about Allah does the Qur'an give? What is meant by belief in Allah? The above discussion has answered these questions. Now this should also be made clear as to why the Qur'an asks all human beings of the world to believe in that idea of Allah, which has been put forward by the Qur'an itself? With the exception of a few atheists every person, every tribe, every community believes in some sort of a deity. But the Qur'an says that this type of belief is, in fact, unbelief in God. This is belief

in those ideas of God that has been developed by you or other people like you. For instance a person says: "I believe that gold is a good metal. It is of white color. It gets rusted in oxidized air. It breaks up into pieces if struck by some solid thing. It is a very light metal and is used in manufacturing aeroplanes." Obviously, if a person believes a metal of these properties to be gold then, indeed, he is denying the existence of real gold. Only that person would be called a believer in gold who believes in correct and real properties of gold. Similarly, if a person claims to believe in God but does not have real attributes of God before him then this will amount to unbelief in God. As such only that person would be accepted as a believer in Allah who believes in the attributes of Allah as enshrined only in the Qur'an.

Distinctive Features of Qur'anic *Eiman* (Conviction)

The idea of Allah that the Qur'an presents is not found anywhere else. Similarly, the relationship between man and God that is portrayed by the Qur'an is also not found at other places. The Qur'an tells us:

1. Allah has Absolute Authority, Power and Rights over the universe. But He uses them in accordance with the Laws that He Himself has formed. These Laws are immutable. In other words the system of universe is functioning according to the already established fixed and immutable principles. These Laws are working in human world also. This means that without any exception every act of man produces an already established result. This, however, is not possible that one type of act produces another type of result. All acts will produce corresponding results. These results emerge in accordance with the Laws established by Allah.

2. No one has begotten Allah. His existence is not from nothingness. These and similar attributes of Allah that relate to His Infinity and Essence cannot be grasped by man. Therefore with the exception of these attributes of Allah the basic attributes of Human Personality are similar to all other attributes of Allah. The difference, however, is that in man they are in contracted and in limited form. In man they are also undeveloped. They can be developed only on the condition that man keeps before him as Standard the attributes of Allah. This is the basic relation between man and God. Obedience to the Divine Laws means to follow the directions given by Allah so as to developing Human Personality; and it is not, God forbid, becoming subservient to the orders of a despotic dictator. The demands and requirements of Human Personality are fulfilled and satisfied by following the Divine Laws. This shows that by discussing about the attributes of Allah (*Asmaul-Husna*) we also discuss (in condensed and limited form) the attributes of Human Personality. Therefore the Qur'an says:

لَقَدْ أَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ كِتَٰبًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ

Laqad anzalnaaa ilaykum Kitaaban-fiihi Zikrukum (21: 10)

"Without doubt We have send towards you the Book that contains your *Zikr*, which means honor, dignity, greatness and also mention and remembrance." In the words of Iqbal, the Muslim thinker and philosopher:

Muhammad bhi tira, Jibrail bhi, Qur'an bhi tera
Magar ye harf-e-shiriin tarjuma tera hai ya mera
Muhammad is yours, Gabriel too and also the Qur'an
But whose eloquent translation it is? Yours or Mine.

3. Once man develops his Self then he starts participating in the creative program of the Divine Personality. In this way man and God become companions. But in this companionship Allah is the most Superior Partner.

Apart from the Qur'an you will not find anywhere else this relationship between man and God. In the religions of the East the relationship between man and God is restricted to worship of God by man. The followers of these religions believe that God has ordered man to worship Him and he has to obey this command willingly or unwillingly. He gets angry if His order is not followed. Gifts and oblations should be offered at His Feet in order to 'please' Him. Or it becomes necessary to approach a 'trusted person of God' for intercession. And when God becomes 'happy' with these kinds of efforts then He fulfills the demands of man. But if He remains 'angry' then man finds himself in difficulties.

As opposed to this, the philosophers of the West believe that God's relationship is only with the physical world in which His Laws are at work in the form of the Laws of Nature. The work of man is to understand these Laws of Nature. Make the forces of nature subservient to him and use them to his benefit. And in the human world man should solve his problems in the light of his own intellect and wisdom. For the guidance of man there are no immutable laws and principles.

Those persons who believe in 'spiritualism' hold this type of relationship with God. They claim that they are in direct communion with God. They converse with Him. They meet Him. They make God accept the prayers of unsuspecting masses. They give to the masses news of the unseen, so on and so forth. Even to think about such a relationship with Allah is against the basic teachings of the Qur'an. Whatever Allah had to tell man He has told him finally and in complete form through His Book, the Qur'an. Now man can develop relationship with Allah only by following His Book, the Qur'an.

This makes it amply clear as to why the Qur'an has said about the 'God-worshippers' of the world that

فَإِنْ ءَامَنُواْ بِمِثْلِ مَآ ءَامَنتُم بِهِۦ فَقَدِ ٱهْتَدَواْ

fa-in aamanuu bi-misli maaa aamantum-bihii faqa-dihta-daw (2: 137)

If they believe in the manner that you (O Muslims) have believed then think that they have got the right path of life. But if they do not believe in the way that you believe and they keep belief in God according to their own fancy then their names would not be included in the register of God as 'the believers in God'. According to the Qur'an this does not amount to believing in Allah with reason and knowledge. This also should be kept in mind that the practical form of believing in Allah is to obey His Directions and Laws. A person who theoretically believes in Allah but practically follows the laws of non-Allah then according to the Qur'an he is not a believer in Allah.

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ

Wa mallam-yah-kum-bimaaa an-zalal-laahu fa-ulaaa-ika humul-kaafiruun (5: 44)

Those who do not decide and judge according to the Laws of Allah they are rejecters of the Truth or disbelievers in Allah.

Asmaul-Husna

By calling the attributes of Allah as *Al-Asmaul-Husna* the Qur'an has attracted our attention towards a fact of great magnitude. The word *Husna* is derived from *husn* (beauty) and *husn* means correct ratio and proportion. If proportion of a thing gets even slightly disproportionate then it does not remain beautiful. Owing to this the historians have said: "If the nose of Cleopatra had been slightly flat then the course of history would have been different."

Asmaul-Husna means that the attributes of Allah besides being complete and loftiest in all respects are in most correct proportion. The fact is that the attributes and peculiarities can produce correct (and constructive) results when they are in proper balance and proportion. No prescription of a doctor can produce desired results if medicines thus prescribed are not in proper balance and proportion. Water is the basis of life. If it were not present in proper proportion in one's body then one would not remain healthy. On the other hand if excessive water is present, say due to flood, then one might drown in it and die. Similarly, some poisons are fatally potent but if it is taken in proper balance and proportion then it turns into life and health giving medicine. Not only in the physical world, this fact is also at work in ethics. To be gentle is a virtuous trait but by exceeding a little it become shamelessness. To forgive and to pardon are good virtues within certain limits but their extremity becomes synonym of cowardice. It is essential to spend money but too much spending is called extravagance and too little spending of money is miserliness. In short, attributes and

peculiarities can produce good positive results when they are in proper balance and proportion. So, in order to produce good and positive results it is essential that *Asma* (attributes) be in *Husna* (proper balance and proportion).

In the Divine Personality *Asma* (attributes) are in *Husna* (proper balance and proportion). Similarly when Human Personality develops then its attributes should also be in proper balance and proportion. The entire teachings of the Qur'an revolve around this axis. The Qur'an clearly and in detail tells us as to which attribute should be manifested in which circumstance and also about the limit of its manifestation.

Attributes that Appear Contradictory

Allah gives life and death too, هُوَ ٱلَّذِى يُحۡىِۦ وَيُمِيتُ *huwallazii yuhyii wa yumiitu* (23:80). He gives شَدِيدُ ٱلۡعَذَابِ *shadiidil azaab* (2:165) severe punishment and He is so relenting that He returns with His *Rahmat* (means of protection and sources of nourishment), ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ *tawwaabur-Rahiim* (2:160). An ordinary man finds contradiction in these attributes. But man with a vision dives deep under the surface and finds out the reality. Then prudently and with categorical confidence he states that there is no contradiction in believing and saying that water gives both life and death. It was ordinary probing of the surface by Christianity when it said that God is Mercy and one can attain salvation by His Grace only and not by the results of one's action. On the other hand 'Karm Yog' philosophy of the Hindus stated that no one could save himself from destruction after doing (small or big) wrong act. The ideology of transmigration of soul from one body to another or *Juna Chakr* is based on this hypothesis. As opposed to both these views the Qur'an said (for example):

1. Poison if used in proper measure can become beneficial.
2. If poison extends a little beyond proper measure then it would produce harmful results.
3. And if poison extends too much beyond proper measure then it produces fatal results.

The third point is that station where Law of Requital would be called *shadiidil azaab*, severe punishment. But with respect to the second point it can be stated that with proper methods harmful effects of poison can be nullified. This is called *tawwaabit*. About this the Qur'an says: إِنَّ ٱلۡحَسَنَٰتِ يُذۡهِبۡنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ *Innal-hasanaati yuzhibnas-sayyi-aat* (11:114), "Good deeds annul ill deeds." This is called pardoning or forgiving.

These facts would be discussed later when we will give detailed exposition of the varying attributes of Allah. Their brief mention had become imperative in order to bring to light the following facts:

a. What is the real meaning of the attributes of the Divine Personality that appear contradictory?

b. What is the importance of *Asma* (attributes) to be *Husna* (in proper balance and proportion)?

c. When these attributes would reflect in proper balance and proportion in the Personality of an individual then that person would possess balanced personality. It is needless to state that a balanced personality is an embodiment of contentment, real peace and happiness.

d. And that society would be a balanced society, which is formed by the association of such balanced personalities. It is again needless to add that with the formation of such a society the entire humanity would live in perfect peace and security.

In relation to the attributes of Allah you will find these things only in the Qur'an and nowhere else. Later on it would be revealed that with the help of these details one could form the ethical values with ease and beauty. Besides, the conflict of good and evil can be solved with ease. From the very beginning this conflict has troubled the philosophers of the world. (This point would be discussed a little later).

Attributes Related to Infinity of Allah

At this juncture there is one more thing of significance. Some attributes of Allah like essence and reality of the Divine Personality are beyond our perception. For instance the Qur'an says: هُوَ ٱلۡأَوَّلُ وَٱلۡأٓخِرُ "*Huwal-Awwalu wal-Aakhiru* (57: 3), He is the First and the Last." We have already stated that we cannot grasp time because it has no beginning and no end. As such when we say that Allah is the First then we cannot correctly grasp His Infinity because our intellect always requires a starting point. Similarly, when we say that He is the Last then also we are unable to grasp His Infinity because our intellect again needs an end point. In short we cannot comprehend the real meaning of 'He is the First and the Last'. At the most we can say like Ghalib:

Na tha kuch to Khuda tha
Kuch na hota to Kuda hota
When there was nothing, there was Allah
Had there been nothing, there would have been Allah

The Qur'an does not demand from us that we understand more than this.

Permanent Values

There are few exceptional attributes of Allah. The rest of His attributes are such, which, in modern terminology, are called ethical values, like Providence, Sustainer, *Rehmaniyat* (provider of nourishment in every situation), etc. These attributes are also called permanent values. In the Qur'anic system of life these values are of immense significance or you can say that the entire edifice of Islam is constructed on their foundation.

This brings us to the question as to why man requires permanent values? This question becomes important because it is believed that man can solve his matters in the light of his thought and intellect. There is no doubt that man has been endowed with thought and intellect. This characteristic makes him distinct from other animals. The Qur'an lays very much emphasis on thought, intellect, knowledge and wisdom. According to the Qur'an those, who do not use their intellect and thought, are شَرَّ ٱلدَّوَآبِّ *sharradda-waaabbi* (8:22), worst of beasts and in a life of ruin (7:179). Owing to intellect and knowledge man ponders over the universe and thereby overpowers the hidden forces of nature. This is how *Malika*, the Forces of Nature, are made to prostrate before Adam, the man.

Human Conflict

Surprisingly, a strange contradiction is shown in the use of intellect by human beings. They are at peace with each other when they are engaged in controlling the forces of nature. Once this is accomplished they enter into conflict with each other over the use of controlled forces of nature. For instance, the scientists of the world peacefully researched atomic energy in their respective laboratories. Once nations got hold of atomic energy they have been at each other's throats over its use and this conflict might one day escalate into a full-fledged war. A war in which the forces of nature meant for the development of humanity might turn into means of human destruction. Why does this happen? The answer is simple: the demands of intellect are such. Every person, every group and every nation tries to protect their respective interests. They are not concerned about protecting the interests of other persons, other groups and other nations. Usury knows that it has no concern with the welfare of others. As such when there is clash of interest between different peoples or nations then their intellects get engaged in battle of wits. In other words the feelings of deriving benefit and warding off harm, effects are inherent in man's animal instinct. The work of intellect is to fulfill the demands of these feelings. Let us explain this by an example. There are two persons A and B. A has a beautiful portrait at his house. B sees it and desires to have it. This is a demand of his feelings or emotions. But A does not want to part with the portrait. From here starts the clash of emotions between A and B.

Consequently the intellect of B suggests to him various methods for grabbing the portrait. On the other hand, the intellect of A suggests to him varying methods of protecting the portrait. This is called clash of intellects. Now the question is: who will succeed? Naturally, one who has more developed intellect will be successful. Thereafter the defeated candidate would try to take revenge. This would lead to riot or disorder. It is clear from this example that human intellect follows human emotions like a dog that follows his *shikar*, the prey.

Rule of Law

In order to solve these conflicts a human society forms certain norms that are implemented equitably on all members of that society. These norms are called laws. This means that different members of that society accept that their matters of conflict would be decided according to the formed laws and not by their intellect, which is guided by emotions. A person who violates those laws is forced by the society to accept and follow them.

Immutable Laws

So, laws are significant in a civilized society. The demands of this significance are:

1. Emotions of any special person, special party or special community should not intervene in the formation of laws.
2. The laws ought not to change at the whims of any person or party.

The Qur'an says that formation of these types of laws is beyond human intellect. In human matters human intellect cannot ignore human emotions. Therefore, these laws should come from a Station that is higher than human emotions and before whom all human beings, of all nations and of all periods, are equal. Such a Station can only be the Divine Personality.

Permanent values are immutable laws. Allah has given them to human beings so that they might seek guidance from them and also decide their matters according to them. In order to make these values operative the human society has been given the right to form byelaws of these values as per the requirements of the times. But no society has been given the right to change or alter or amend the immutable laws. We have already stated that these immutable laws or permanent values are those attributes of Allah that, for better understanding, are termed 'ethical values'.

To Understand Qur'anic Principles

Human intellect cannot form permanent values or immutable principles. This has already been stated. This, however, does not mean that it is beyond human intellect to understand these permanent values. Not only this, human intellect can easily discern that the permanent values are true in their claim and they fulfill their objective. But this is possible with the condition that man ponders over the permanent values like a

scientist. We all know that a scientist uses his intellect and prudence to objectively ponder over the physical world. Besides, he does not let his emotions and feelings influence his work. If one ponders over the permanent values in this manner then the truthfulness of the permanent values will automatically emerge out in the open. Interestingly, the Qur'an has itself given a scale to measure the truthfulness of its claim. A verse in *Surah Yunus* says:

بَلْ كَذَّبُوا۟ بِمَا لَمْ يُحِيطُوا۟ بِعِلْمِهِۦ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُۥ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ
ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلظَّٰلِمِينَ

Bal kazzabuu bimaa lam yu-hiituu bi-ilmi-hii wa lam-maa ya'ti-him ta'wiiluh: Kazaa-lika kazza-ballaziina min-qab-lihim fanzur kayfa kaana aaqi-batuz-zaali-miin! (10:39)

The first point in this verse is about those people who oppose the Qur'anic claim. They do so because they do not try to comprehend the Qur'anic facts at intellectual level. لَمْ تُحِيطُوا۟ بِهَا عِلْمًا *Lam tuhiituu bihaa ilman* (27:84). In order to understand the Qur'anic facts it is essential that man keep before him that level of knowledge, which might have been achieved during his period. The unveiling of the Qur'anic facts corresponds to the increase in level of a particular period.

The second point is that a person who ponders over the Qur'anic facts should necessarily keep before him the history of the world and particulars of communities gone by. In this way he will not only see but also compare the consequences of those nations that lived their lives according to the Qur'anic principles with those nations that violated the Qur'anic principles. Owing to this reason the Qur'an has repeatedly emphasized on the study of history.

And the third point suggests a pragmatic test. Let a society based on the Qur'anic principles be established. The results of that society would automatically reveal whether permanent values are based on truth or not.

The truthfulness of the Qur'anic facts unveil one by one if one ponders over them in the aforesaid manner. But the condition, as was stated earlier, is that pondering should be bereft of emotions. Truth cannot emerge if emotions are not obedient to the guidance of the Divine revelation as enshrined in the Qur'an. The Qur'an asks:

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ ٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ ٱللَّهِ

Wa man azallu mimmanittaba-a ha-waahu bi-gayri hudam-minallaah? (28:50)

"Who is more misguided than a person who follows his own emotions and not the Divine Guidance?"

Good and Evil

This fact has already come before us that permanent values or immutable laws, on which human society ought to be established, have branched out from the attributes of Allah. Thus it is essentially important to have proper concept of the attributes of Allah. More so, because the complex problem of good and evil gets automatically solved with the proper concept of the attributes of Allah and by the Qur'anic exposition of *Asma* (attributes) being *Husna* (in proper balance and proportion). In short, a work or action that aids in developing, strengthening and integrating Human Personality is good. Obviously such a work or action is in accordance with permanent values or the attributes of Allah. On the other hand evil is that work or action that produces weakness and disintegration in Human Personality. Needless to add that such a work or action is against permanent values. This is the standard of good and evil in the world. This aspect also shows the relationship between the Divine Personality and Human Personality and their importance.

All Embracing Nature of the Divine Attributes

It is amply clear from the above discussion that no aspect of the universe or the human world is unrelated to the attributes of Allah. In the human world either it be the individual life of one person or organized group of human beings, all of them establish and become complete in accordance with the pattern of the Divine attributes. These attributes are the Standard for the development of Human Personality. From these immutable principles take shape. And by following them a human society finds itself on the path of eternal bliss. Human success is related to these attributes. And the future exaltation of man is attached to these attributes. By remaining aloof from these attributes life cannot achieve human level, it remains stagnant at animal level or at a more lower level.

So, proper idea about the attributes of Allah is very significant in human life. Owing to this reason the Qur'an has laid very much emphasis on belief in Allah. Belief in Allah means to have unflinching faith, with reason and knowledge, in the attributes of Allah. The entire edifice of human life is built on this faith. This is that seed which produces chaste and pure tree of good deeds. And to quote Dr. Muhammad Iqbal, the poet, the Muslim philosopher and thinker: "*Aml se zindigi banti hai Jannat bhi Jahannum bhi*, life of eternal bliss and that of perdition are products of good and bad actions respectively."

As such belief in Allah is that axis around which the entire universe of man revolves. Owing to this reason the Qur'an has elucidated with clarity and in detail the exposition of the attributes of Allah. Such specification of the attributes of Allah you will find only in the Qur'an and not in religious Scriptures of the world or in the thoughts of the philosophers. Therefore, the teachings of the Qur'an are unique and incomparable. The Qur'an has given complete idea about the attributes of Allah. And Allah Himself has taken the responsibility of protecting His Book. This is to suggest that now no new Book or Messenger would come and none is required.

==========